OPEN ACCESS

AL-TABYEEN

(Bi-Annual Research Journal of Islamic Studies)

Published by: *Department of Islamic Studies, The University of Lahore, Lahore.*

ISSN (Print) : 2664-1178
ISSN (Online) : 2664-1186
Jan-jun-2022
Vol: 6, Issue: 1
Email: altabyeen@ais.uol.edu.pk
OJS: hpej.net/journals/al-tabyeen/index

محدثین اور سیرت نگاروں کے اختلاف میں ترجیح کی صورتیں

Cases of priority in the disagreement of Muhadditheen and biographers

Mirza Imran Haider
PhD Scholar, Institute of Islamic Studies, Punjab University, Lahore.
Dr. Ghulam Ali Khan
Professor, Institute of Islamic Studies, Punjab University, Lahore.

ABSTRACT

The current study critically analyses the preferential characteristics of the study of Hadith, and Seerah of the Holy Prophet (S.A.W) in case of conflict which arises among theexperts of the both. All the branches of Islamic knowle dge rely on the authentic traditions which are attributed to the Holy Prophet (S.A.W). The major sources of knowledge in Islamic tradition are based on the narrations which have been reported to us by the narrators. There are different parameters to evaluate the authenticity of Hadith and there is a consensus on several particulars of the parameters of the traditions of the Holy Prophet (S.A.W). However, there exist some variant thoughts on some principles of difference between Hadith and Seerat among the scholars. The current study focuses to discuss the line of demarcation between Hadith and Sunnah in the form of conflict among the experts. The review of the existing literature reveals that the most of the conflicts are based on misapprehension. The qualitative research approach has been used for the current study using interpretive school of thought. The study concludes that if

the narration is high in authenticity the preference will be given the point of view of Muhaddissin.
Keywords: Hadith, Seerat, Ikhtilaf e Seerat, Authenticity of Seerat, Muhaddiseen aur Seerat Nigar

علوم اسلامیہ کی تمام شاخوں کا محور و مرکز رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ اور نبی کریم ﷺ سے صادر ہونے والا ہر قول اور فعل وحی کی بنیاد پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾[1]

"اس وحی کی حفاظت اور حقانیت کی ذمہ داری خود رب کریم نے اٹھائی ہے۔"

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾[2]

یہاں پر ذکر سے مراد قرآن کریم کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر و تبیین بھی ہے کہ اس کی حفاظت کا وعدہ بھی خود باری تعالیٰ نے اٹھایا ہے:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾[3]

اللہ تعالیٰ نے وحی کے جمع کرنے تلاوت کرنے اور اس کی تبیین تمام امور کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ یہ وحی الٰہی یعنی قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو قیامت تک آنے والے ہر انسان کو عاجز کر رہا ہے۔ آج ہم پورے یقین اور ایمان کے ساتھ اسی قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ امت کے حوالے کر کے گئے تھے۔

اللہ کریم نے اپنے وعدے کی تکمیل کے لیے امت مسلمہ میں ایسے افراد کار پیدا فرمائے جنہوں نے اس ذمہ

---

(1) النجم 53: 3۔ 4

(2) الحجر 15: 9

(3) القیامہ75: 16۔ 18

داری کو بطریق احسن پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ جن کی زندگیوں اور تمام تر صلاحیتوں کو مالک حقیقی نے حفاظت وحی کے مشن کے لیے قبول فرمایا۔

علوم اسلامیہ کی ہر شاخ رسول اللہ ﷺ سے روایت یا روایت سے استنباط پر انحصار کرتی ہے۔ روایت کا تعلق سند و متن اور درایت پر مشتمل اصول الروایہ کے ساتھ ہے اور روایت سے استنباط کا تعلق اصول فقہ کے ساتھ ہے۔ سند و متن (اصول الروایہ) کے ذریعے ہمیں تین چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرت النبی۔ ان میں سے قرآن کریم کلام الٰہی ہے جو متعبد بتلاوۃ ہے۔ ایک نقطے اور حرکت تک میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سنت اور سیرت نبی کریم کی طرف منسوب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایت کو کہتے ہیں۔ جس میں قول، فعل اور تقریر تو نبی کریم ﷺ کی ہوتی ہے اور اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ صحابہ کرام کے ہوتے ہیں۔ الفاظ قرآن اور تبیین قرآن ان دو ذرائع یعنی قرآن و سنت کی روایت کے ذریعے قیامت تک کے لیے محفوظ ہیں۔ الفاظ قرآن کی ادائیگی کے لیے سبعہ احرف کی کیا تفصیل ہے؟ وہ قراء کے ہاں معروف ہے۔ اسی طرح سنت کے الفاظ اور مفہوم کا تعین کیسے ہوگا؟ یہ بھی اہل فن کے ہاں موجود اور محفوظ ہے۔ دونوں کی سند میں بنیادی طور پر جس بات کا اہتمام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اور سنت کی روایت کی رسول اللہ کی طرف نسبت کو یقینی بنایا جائے۔ قرآن کریم کے بارے میں روایت کے یقینی نہ ہونے پر اسے قراءت شاذہ یا قراءت ضعیفہ کا نام دیا گیا۔ اسے قرآن نہیں کہہ سکتے اور سنت کی روایت میں عدم یقین کی صورت میں اس کی تفصیلات طے کر دی گئی ہیں۔ روایت میں ضعف کی موجودگی میں اس کی نسبت رسول اللہ کی طرف نہیں کی جا سکتی۔ نبی کریم ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت انتہائی حساس معاملہ ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾[1]

حدیث متواتر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[2]

---

(1) الاسراء 17: 36

(2) بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دار طوق النجاۃ، بیروت، 1422ھ، رقم الحدیث :107

"جس نے میرے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"

سنت کی روایت آگے چل کر دو صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔

1۔روایت حدیث 2۔روایت سیرت

دونوں سلسلوں کو روایت کرنے والے علماء کے دو طبقے بن گئے۔

پہلا طبقہ محدثین اور دوسرا طبقہ سیرت نگار یا مؤرخین کہلایا۔

روایت کے یہ دو مستقل سلسلے بننے سے ان کے ماہرین اور ان کے اصول و قواعد میں بھی کافی فرق پیدا ہو گیا۔

دو مستقل فنون بننے سے ان میں مشترکات بھی ہیں اور مختلفات بھی مختلفات معرض وجود میں آنے پر کسی ایک کو دوسرے پہ ترجیح یا ایک کو قبول اور دوسرے کو رد کیا جائے گا۔

حدیث اور سیرت میں تعارض کا وجود

نبی کریم ﷺ کی ذات مطہرہ اور آپ کے متعلقات کا بیان سیرت کہلاتا ہے۔ سیرت کے ماخذ کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں قرآن مجید، تفاسیر، حدیث، تاریخ، لغت، انساب اور جغرافیہ وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ تو سیرت کا جو حصہ قرآن مجید سے ثابت ہے وہ تو بطور قرآن محفوظ بھی ہے اور متعبد بتلاوہ بھی ہے۔ اسی طرح سیرت کا جو حصہ صحیح حدیث سے ثابت ہے اس کی حیثیت بھی واضح ہے کہ یہ دونوں یعنی قرآن و حدیث وحی کا حصہ ہیں۔ ان سے ثابت شدہ سیرت کا حصہ بھی محفوظ و مامون ہے۔ ان دونوں ماخذ کے علاوہ دیگر ماخذ سے اخذ شدہ سیرت کو جب دیکھا جاتا ہے۔ تو اس کا کچھ حصہ تو وہ ہے جو حدیث و سنت سے ثابت شدہ سیرت کے موافق ہے اور کچھ حصہ وہ ہے جو حدیث و سنت میں بیان کردہ سیرت سے زائد یا اس کے مخالف ہے۔

اب سیرت کا جو حصہ سنت سے ثابت شدہ حصے کے مخالف ہے اس کا کیا جواب یا حل ہے؟ اس کے حل سے پہلے یہ امر دیکھنا ضروری ہے کہ محدثین اور سیرت نگاروں کا مقصد اور روایات سیرت کو جمع کرنے کا منہج کیا ہے؟

محدثین کا طریقہ

محدثین کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام پہلوؤں کو محفوظ کرنا ہے۔ بالخصوص احکام شریعت سے متعلق روایات کو محفوظ کرنا۔ اس کے لیے وہ سند و متن کی تحقیق کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے روایت کرتے ہیں۔ محدثین صرف وہی روایات نقل کرتے ہیں جن کی رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت ان کے اصولوں

کے مطابق یقینی ہوتی ہے۔ ان روایات سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی حفاظت کا معیار بھی نہایت بلند ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی لفظ کے بارے میں شک ہو کہ رسول اللہ نے یہ لفظ استعمال کیا تھا یا دوسرا تو ایسے موقع پر محدثین راویوں کی صراحت کے ساتھ اس لفظی فرق کو بھی واضح کرتے ہیں۔

سیرت نگاروں کا طریقہ

سیرت نگاروں کا مقصد بھی رسالت مآب کی زندگی اور ان کے متعلقات کے تمام پہلوؤں کو محفوظ کرنا ہے۔ تاہم ان روایات سے شرعی احکام کا استنباط اصلاً مقصود نہیں ہوتا اس لیے ان روایات کو قبول کرنے کا معیار بھی محدثین کے معیار سے فروتر ہوتا ہے۔ دوسری بات مؤرخین اور سیرت نگاروں کے پیش نظر یہ ہوتی ہے کہ سیرت کے واقعات کو زمانی ترتیب اور واقعاتی تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے اس لیے وہ روایت کے الفاظ کی نسبت روایت میں بیان کردہ واقعہ کو مرتکز کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس تواریخ، اماکن اور متعلقات سیرت کا علم زیادہ ہوتا ہے۔

محدثین اور سیرت نگاروں کے اختلاف میں وجوہ ترجیح

محدثین اور سیرت نگاروں میں تعارض کی صورت میں اس کا حل یا ترجیح کی صورتیں کیا ہیں؟ اس پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا تعارض ہے بھی یا نہیں۔ تو اس کی صورت صحیح تفہیم کی ہے۔ اس کے بعد ہی تعارض یا عدم تعارض کا تعین کیا جائے گا۔

تعارض کا حل بذریعہ تفہیم روایت

سب سے پہلے تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ حدیث و سیرت میں اختلاف ہے بھی کہ نہیں کیونکہ بسا اوقات حدیث کے فہم میں غلطی کو سیرت سے ٹکراؤ سمجھ لیا جاتا ہے یہاں مسئلہ اختلاف کا نہیں بلکہ حدیث کی تفہیم کا ہوتا ہے۔ جسے مشکل الحدیث کہا جاتا ہے اگر حدیث کا صحیح مفہوم سمجھ لیا جائے تو اختلاف تو خود ختم ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر امام بخاری، حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہم میں سے کون آپ کو پہلے ملے گا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: جس کا ہاتھ تم میں سے سب سے زیادہ لمبا ہے۔ سب ہاتھوں کی پیمائش کرنے لگیں تو ان میں سے سب سے لمبا ہاتھ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا تھا جبکہ آپ ﷺ کے بعد

سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں تو ہمیں سمجھ آئی کہ وہ صدقہ کرنے کے اعتبار سے لمبے ہاتھ والی تھیں اور وہ ہم میں سے سب سے پہلے رسول اللہ کو ملنے والی تھیں۔[1]

اس روایت کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بیان کے مطابق رسول اللہ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وفات پانے والی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ہوں گی۔ حالانکہ اہل سیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحش فوت ہوئیں جبکہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بعد میں ہوا۔[2]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں الشیخ محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں:

" أَجْمَعَ أهل السّير على أَن زَيْنَب أول من مَاتَ مِنْ أَزْوَاجِهِ"[3]

"اہل سیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے سب سے پہلے حضرت زینب فوت ہوئیں"

اس کی شرح میں ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"لاخلاف بين اهل الاثر والسير ان زينب اول من مات من ازواج النبي"[4]

"اہل اثر اور اہل سیر کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔"

اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بخاری کی روایت میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ذکر ہے جبکہ اہل سیر کا اتفاق یا اجماع ہے کہ رسول اللہ کے بعد سب سے پہلے فوت ہونے والی حضرت زینب ہیں۔ لہٰذا اس تاریخی مسئلے میں بخاری کی روایت پر سیرت نگاروں کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔[5]

---

(1) بخاری، الجامع الصحیح ، ، رقم الحدیث:1420

(2) ابن سعد، محمد بن سعد ، الطبقات الکبری، دار الکتب العلمیه، بیروت ، طبع اول، 1990ء،8، 44؛ القسطلانی، احمد بن محمد بن ابی بکر، المواہب اللدنیه بالمنح المحمدیه، المکتبه التوفیقیه ، قاہره،1، 497

(3) ابن حجر،ابو الفضل،احمد بن علی،العسقلانی، فتح الباری ، دار المعرفه ، بیروت ، 1379ھ، 3، 287

(4) ابن بطال، ابو الحسن علی بن خلف، شرح صحیح البخاری، مکتبه الرشد، الریاض طبع دوم، 2003ء،3، 418

(5) محمد ہمایوں عباس،ڈاکٹر،علوم السیرۃ،پروگریسو بکس سنٹر،لاہور،2020ء،ص:368-372

اس مؤقف کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

1۔ بخاری کی روایت میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ذکر نہیں ہے بلکہ کسی کا بھی نام نہیں لیا گیا یہ تو امہات المومنین کا فہم تھا کہ انہوں نے رسول اللہ کے بیان کردہ کنایہ کو حقیقت پر محمول کرتے ہوئے ہاتھوں کی لمبائی ماپنا شروع کر دی فقیہہ کی فقاہت سے روایت کی صحت یا قبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امہات المؤمنین نے جو سمجھا وہ ان کا فہم تھا، روایت سے یہ مراد نہیں تھا۔ روایت میں ہاتھ کی لمبائی سخاوت سے کنایہ ہے اور امہات المؤمنین میں سے حضرت زینب سب سے زیادہ سخاوت کرنے والی تھیں۔

2۔ بخاری کی روایت میں کنایہ استعمال ہوا ہے جبکہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی صراحت ہے۔[1]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بیان کی، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی اور اہل سیر نے تفصیل بیان کر دی کہیں بھی تعارض نہیں ہے۔ جب تعارض نہ رہا تو اس مثال سے محدث کی روایت پر اہل سیر کی روایت کو ترجیح دینے کا اصول ثابت نہیں ہوتا۔

دوسری مثال: امام بخاری اپنی جامع میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں جس کے مطابق ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو قینقاع کے بازار کی طرف گئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے صحن میں بیٹھے۔[2]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے بارے میں اہل سیر کا اتفاق ہے کہ وہ بنو قینقاع کے علاقے میں نہیں تھا۔ اس بارے میں تاریخ الخمیس میں ہے:

"كان بيت فاطمة فى موضع مخرج النبىّ صلّى الله عليه وسلم وكانت فيه كوّة الى بيت عائشة"[3]

"حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے راستے میں تھا اور اس کی ایک کھڑکی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف تھی۔"

(1) نیسابوری، مسلم بن الحجاج، الصحیح المسلم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، رقم الحدیث: 2452

(2) الصحیح البخاری، رقم الحدیث: 2122

(3) بکری، حسین بن محمد بن الحسین، تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس، دار صادر، بیرت، س۔ن، 4/ 347

وفاء الوفاء میں ہے:

"کان باب بیت فاطمة بنت رسول الله في المربعة التی فی القبر"[1]

"حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر اس احاطہ میں تھا جس میں قبر مبارک ہے۔"

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس حدیث پر داؤدی کا قول نقل کرتے ہیں:

"سقط بعض الحدیث عن النافل او دخل حدیثاً فی حدیث"[2]

"راوی (ناقل) سے اس حدیث کا بعض حصہ ساقط ہو گیا ہے یا پھر اس نے ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ملا دیا ہے۔"

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث بیان کی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنو قینقاع جانے اور پھر واپس آنے کا تذکرہ ہے۔[3]

صحیح بخاری کی روایت میں حدیث کا بعض حصہ رہ گیا ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مکمل کر دیا ہے۔ لہٰذا بخاری کی روایت کو اہل سیر کی روایت کی بنیاد پر مرجوح یا متروک نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث یعنی امام مسلم کی روایت سے ہو گئی ہے۔ اس کی بنیاد پر حدیث کا بعض حصہ رہ جانے کا حکم لگایا جائے گا نہ کہ اس کے ضعف، متروک یا مرجوح کا۔

تیسری مثال: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت بیان کرتے ہیں کہ واقعہ افک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں فرمایا کون ہے کہ جو ان منافقوں کے مقابلے میں مستعد ہو، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی کہ میں مستعد ہوں۔[4]

اہل سیر کے مطابق حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوہ احزاب میں زخمی ہوئے اور اس کے بعد بنی قریظہ کے بارے میں فیصلہ کر کے فوت ہو گئے اور واقعہ افک غزوہ بنی مصطلق (غزوہ مریسیع) سے واپسی پر پیش آیا، اس وقت

---

(1) سمہوی، علی بن عبد الله، نور الدین ، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، دار الکتب العلمیه، بیروت، 1419ھ، 2۔46

(2) فتح الباری ، 4۔ 341

(3) الصحیح المسلم ، رقم الحدیث : 2421

(4) بخاری ،الجامع الصحیح ،رقم الحدیث:، 3۔ 173)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ موجود ہی نہیں تھے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک اور روایت میں ہے۔ پھر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا میں اس کا جواب دیتا ہوں تو اس روایت میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں:

"وهذا هو الصحيح لاشك فيه و ذكر سعد بن معاذ وهم"

"بے شک یہی بات صحیح ہے اور سعد بن معاذ کا ذکر وہم ہے۔"

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال غزوہ بنی قریظہ کے بعد ہوا جو ذی قعد چار ہجری میں ہوا اور واقعہ افک غزوہ بنی مصطلق کا ہے جو شعبان چھ ہجری میں ہوا۔ یعنی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے ایک سال اور آٹھ ماہ بعد۔[1]

اس روایت میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا نام راوی کے وہم کی وجہ سے ہے لہٰذا درست نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کسی بھی حدیث کی حقانیت واضح ہو چکی ہے اب اگر بخاری، مسلم یا کسی اور محدث کی روایت میں کوئی راوی کا وہم یا غلطی نکل آئے تو دیگر محدثین اسے درست کر دیتے ہیں۔ چند ایک مثالوں کو بنیاد بناتے ہوئے کوئی قاعدہ و قانون تشکیل نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ ضابطہ تو اکثری حالات کی بنیاد پر بنایا جاتا ہے۔ استثنائی صورتیں قواعد کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ روایات کے بیان کرنے میں مؤرخین اور سیرت نگاروں کا معیار محدثین کرام کے معیار سے فروتر ہے۔ لہٰذا سنت اور سیرت میں تعارض کی صورت میں ترجیح سنت و حدیث کو حاصل ہو گی۔ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سیرت کے مقدمہ میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

محدثین کو سیرت نگاروں پر ترجیح دینے کی صورت

محدثین اور اہل سیر دونوں ہی راوی ہیں۔ روایت میں اوثق کی روایت کو ثقہ کی روایت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ محدثین کی احتیاط اور ثقاہت کا معیار اہل سیر سے زیادہ ہے لہٰذا ترجیح بھی محدثین کو ہی حاصل ہو گی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

[1] ابن قيم الجوزيه، محمد بن ابى بكر، زاد المعادفى هدى خير العباد، مؤسسة الرساله ،بيروت ، 1994ء،3، 238

غزوہ ذی قرد کی تاریخی حیثیت کے بارے میں اہل سیر کا موقف ہے کہ یہ غزوہ صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا۔ اس کے قائل سیرت نگاروں میں سے واقدی، ابن اسحاق، سہیلی، ابن سعد اور ابن حزم ہیں۔

مقریزی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول:

"لَا يَخْتَلِفُ أَهْلُ السِّيَرِ أَنَّ غَزْوَةَ ذِي قَرَدٍ كَانَتْ قَبْلَ الْحُدَيْبِيَةِ "(1)

"اہل سیر کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے ہوا۔"

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ الْبَيْهَقِيُّ الَّذِي لَا نَشُكُّ فِيهِ أَنَّ غَزْوَةَ ذِي قَرَدٍ كَانَتْ بَعْدَ الْحُدَيْبِيَةِ وَخَيْبَرَ"(2)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ اور خیبر کے بعد ہوا۔"

دوسری جگہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

" مَا فِي الصَّحِيحِ مِنَ التَّارِيخِ لِغَزْوَةِ ذِي قَرَدٍ أَصَحُّ مِمَّا ذَكَرَهُ أَهْلُ السِّيَرِ"(3)

"صحیح مسلم کی روایت (صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب غزوۃ ذی قرد وغیرھا) کے مطابق بھی غزوہ ذی قرد حدیبیہ کے بعد ہوا۔"

اہل سیر غزوہ ذی قرد کا وقوع حدیبیہ سے پہلے بتاتے ہیں اور محدثین صلح حدیبیہ کے بعد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کی روشنی میں محدثین کی بات کو ترجیح دی جائے گی۔ اس بارے میں دلچسپ بات مولانا عبدالرؤف داناپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہتے ہیں "تمام اصحاب سیر اس غزوہ کو حدیبیہ سے پہلے لکھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے بھی یہاں لکھا لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ غزوہ غزوہ حدیبیہ کے بعد ہوا۔" (4)

اہل سیر کو محدثین پر ترجیح دینے کی صورت

یہاں مسئلہ چونکہ روایت کے بیان کرنے کا ہے، لہٰذا مؤرخین یا سیرت نگار کسی روایت پر متفق ہوں اور ان کی روایت کسی محدث کی روایت کے برعکس ہو تو کثرۃ رواۃ کے ضابطے سے مؤرخین اور سیرت نگاروں کی روایت کو

---

(1) مقریزی، احمد بن علی بن عبد القادر، امتاع الاسماع، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1999ء، 8، 390

(2) فتح الباری، 7، 421

(3) فتح الباری، 4، 461

(4) دانا پوری، عبد الرؤف، مولانا، اصح السیر، بک ڈپو دیوبند، یو پی (انڈیا)، س۔ن، ص: 194

ترجیح دی جائے گی۔ البتہ اس اصول کو عملی طور پر اختیار کرنے کے لیے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت ہے جو تاحال سامنے نہیں آسکیں۔

تاریخی یا سیرت کے معاملات میں اہل سیر کو محدثین پر ترجیح دینے کے حوالے سے جو مثالیں عموماً پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ہم نے اس مضمون میں مطالعہ کیا ہے اور یہی بات سامنے آئی ہے کہ محدث کی کسی روایت کا کوئی حصہ رہ جانے، دوسرے روایت سے مکس کرنے یا کسی لفظ کی ادائیگی میں راوی سے وہم سرزد ہونے پر کسی دوسرے محدث نے اس کی اصلاح کر دی۔ لہٰذا سیرت نگاروں یا مؤرخین کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ مزید مثالوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہ بات کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی محدث کی روایت میں کسی راوی کو وہم ہوا اور اہل سیر و مؤرخین کی روایت اس وہم سے پاک ہے تو اس صورت میں اہل سیر و مؤرخین کی روایت کو لیا جائے گا۔ مثال کے طور پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو جب شام میں حضرت ابوسفیان کی انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے صرف تین دن سوگ منایا۔[1] امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں شام کا ذکر نہیں ہے۔[2]

اس مسئلہ میں اہل سیر کا موقف یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان کی وفات مدینہ میں ہوئی۔[3]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فی قوله من الشام نظر لان ابا سفيان مات بالمدينة بلا خلاف بين اهل العلم بالاخبار"[4]

"ان کے اس قول میں شام کا ذکر محل نظر ہے کیونکہ حضرت ابوسفیان کے مدینہ میں فوت ہونے کے بارے میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

---

(1) بخاری ،الصحیح البخاری ،رقم الحدیث: 1280، باب احداد المراۃ علی غیر زوجہا، 2، 78

(2) الصحیح المسلم، 2، 1123، رقم الحدیث: 1486

(3) المزی، ابو الحجاج، یوسف بن عبد الرحمان ،تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مؤسسة الرساله ، بیروت ، 1980ء،13، 121؛ النووی، ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف، تہذیب الاسماء واللغات ،دار الکتب العلمیه،بیروت،2، 240

(4) فتح الباری ، 3، 147

اختلاف کا حل: اس مثال یہ تاثر مل رہا ہے کہ محدثین کی بات غلط اور اہل سیر کی بات درست ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابو سفیان کا انتقال مدینہ میں ہوا۔ رہی یہ بات کہ بخاری کی روایت میں شام کا ذکر ہے تو اس روایت میں لفظ شام کا ذکر راوی کا وہم ہے۔ لہٰذا لفظ شام کا بیان درست نہیں جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صراحت کر دی ہے۔

جب کسی روایت میں کسی راوی کو وہم ہو جائے تو صرف اس قدر حصہ درست نہیں ہو تا بقیہ روایت اپنے اصل حکم پر باقی رہے گی۔ ابو سفیان کا انتقال شام میں ہونے کا موقف محدثین کا نہیں ہے۔ ایک روایت میں کسی راوی کے وہم سے بیان ہوا جس کی اصلاح کر دی گئی۔

حاصل کلام: ابو سفیان کے مقام وفات کو محدثین نے بیان نہیں کیا۔ شام کا ذکر وہم پر مبنی ہے اور اہل سیر نے ابو سفیان کی وفات کی جگہ مدینہ بتائی ہے جو درست ہے۔ محدثین اور مؤرخین میں حقیقی تعارض اس وقت ہو گا جب تمام محدثین ایک طرف اور تمام مؤرخین دوسری طرف ہوں اور مسئلے کے تاریخی یا معلوماتی ہونے کی صورت میں دیگر قرائن کی بنیاد پر مؤرخین کو ترجیح دی جائے گی جب اس نوعیت کی کوئی مثال پیش کی جائے گی تو پھر یہ اصول لاگو ہو گا لیکن تاحال اس کی مثال ندارد ہے۔

اہل سیر کے باہمی اختلاف کی صورت

ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات تاریخی روایت میں سیرت نگاروں کا باہمی اختلاف ہو جاتا ہے۔ جنہیں دیگر قرائن کی روشنی میں حل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے غزوات کی تعداد کے بارے میں 19، 21، 24 اور 27 غزوات کی روایات موجود ہیں۔[1]

اب غزوات کی تعداد کوئی تشریعی معاملہ نہیں بلکہ تاریخی اور واقعاتی ہے۔ اس میں اختلاف ہے اور ان میں تطبیق کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جس کے لیے قرائن سے مدد لی جائے گی۔ ان قرائن کی بنیاد پر اس سیرت نگار یا اس کی تالیف کی نفی نہیں کی جاتی کیونکہ تعارض دو برابر درجے کے دلائل کے درمیان ہو تا ہے اگر ان

[1] حاکم نیشاپوری، محمد بن عبد الله، معرفة علوم الحديث، دارالكتب العلميه ،بيروت، 1977ء، ص: 239

کے درجات الگ الگ ہوں تو ہر دلیل کو اس کے درجے کے مطابق لیا جاتا ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں میں اختلاف کی صورت میں اصولی طور پر ترجیح محدث کو ہی ہو گی۔ روایت کے کسی لفظ کے بارے میں کسی راوی کو وہم پیدا ہو گیا تو صرف اس قدر حصہ ہی وہم پر مشتمل ہو گا بقیہ حصہ اور مجموعی طور پر حدیث صحیح ہی ہو گی۔

حاصل بحث

1. محدثین اور سیرت نگاروں کے اختلاف میں ترجیح کی صورتوں کا جائزہ لینے سے درج ذیل باتیں سامنے آئی ہیں:
2. علوم اسلامیہ کا منبع اور مرکز رسول اللہ کی ذات اقدس ہے۔
3. رسول اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جا سکتی ہے جو سند سے ثابت ہو۔
4. سیرت النبی سے متعلق معلومات پہنچانے میں محدثین کا معیار بلند تر ہے۔ اس لیے سیرت نگاروں اور محدثین میں اختلاف کی صورت میں ترجیح محدثین کو دی جائے گی۔
5. سیرت سے متعلق کسی بھی واقعہ کی حسن ترتیب اور متعلقات سیرت کی تفصیلات سیرت نگاروں کے ہاں زیادہ عمدہ انداز میں پائی جاتی ہے۔
6. حدیث کے فہم میں کسی اختلافی نکتہ کے سیرت سے متعارض ہونے کی صورت میں اسے حدیث کا سیرت سے تعارض شمار نہیں کیا جائے گا بلکہ فقہ الحدیث کے ذریعے حدیث کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے گا جس کا سیرت سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔
7. تاریخی یا معلوماتی پہلو سے کسی مسئلہ میں تمام سیرت نگار متفق ہوں اور کوئی محدث ان کے برعکس بیان کرے، تو ترجیح سیرت نگاروں کو دی جائے گی۔
8. محدثین کا اختصاص سیرت کے تشریعی پہلو میں ہے اور اہل سیر کا اختصاص واقعاتی ترتیب، تاریخ اور متعلقات سیرت میں ہے۔